علی محمد فرشی

ضیا جالندھری کی نظم ''بڑا شہر'' کا تجزیاتی مطالعہ

Ali Muhammad Farshi

An Analytical Study of Poem "Barra Shehr" by Zia Jalendhary

Zia Jalandhary is a most prominent name in Modern Urdu Poetry . His poem"Barra Shehr"is a unique poem amongst modern urdu poems.This anaysis shows the creature aspects of this poem.

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے جو بڑی صنعتوں کے مرکز اور بندرگاہ کی موجودگی کے باعث ملکی معیشت کا جزوِاعظم ہے۔پوری دنیا کے ساتھ معاشی رشتوں کے حوالے سے بھی اس شہر کی اہمیت نمایاں ہے جس کے باعث دنیا بھر کے باشندوں کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں مثلاً پنجاب،سرحد ،بلوچستان،اندرونِ سندھ اور آزاد کشمیر سے کاروبار پیشہ ،ہنر مندوں اور کارکنوں کی بڑی تعداد بھی کراچی کا رخ کرتی ہے ۔یہ پاکستان کا واحد شہر ہے جس کی سماجی ساخت نہایت پیچیدہ اورشناخت بوقلموں ہے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی بہت بڑی تعداد یہاں آباد ہوئی۔ یوں مختلف عمرانی طبقوں کی رنگا رنگی سے ایک ایسی معاشرت نے جنم لیا جس کی مثال ملک کے کسی دوسرے شہر میں دکھائی نہیں دیتی ۔

اس شہر نے نہ صرف پورے ملک کی معیشت کا بوجھ سنبھالا اوراندورنِ ملک اور ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کے پاؤں تلے اپنا دل بچھایا بلکہ ہر انسان کو بلا تفریقِ ذات زبان اور رنگ ونسل قبول کیا اور پالا پوسا ۔لیکن اس کی بدقسمتی دیکھیے کہ اِنھی لوگوں نے اسے ماں کا رتبہ دینے کی بجائے طوائف بنا دیا ۔اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ غیر مما لک سے آنے والے ہوں کہ اندرونِ ملک سے ،ہجرت کے بعد مستقل طور پر آباد ہونے والے اس شہر کو اپنا نہیں سمجھتے ۔حتیٰ کہ دیہی علاقوں کے وہ افرد جو نا قابلِ برداشت معاشرتی تفاوت کے نتیجے میں یہاں آ کر آباد ہو جاتے ہیں جہاں انھیں کوئی ''کمی کمین'' کا طعنہ نہیں دے سکتا، بھی اس شہر کو اپنا نہیں کہتے اور اپنی وابستگی آبائی علاقے سے قائم رکھتے ہیں ۔اور اس شہر میں قیام کو محض ذہنی فرار کا ایک معاشرتی ذریعہ سمجھتے ہیں۔پھر کچھ کاروباری اور مذہبی گروہ بھی ہیں جو اپنے وجود کی بقا کے لیے اسی شہر کو مفید اور محفوظ سمجھتے ہیں ۔چنانچہ وہ بے لوث رشتہ جو کسی زمین اور انسانوں کے درمیان فطری طور پر موجود ہوتا ہے یہاں استوار ہی نہیں ہو سکا۔آیئے دیکھتے ہیں کہ ضیا جالندھری اس شہر کے بارے میں کیا محسوسات رکھتے ہیں۔

ضیا جالندھری نے کراچی کے پورے وجود کو ایک حساس شاعر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔نظم کی واردات یہ ہے کہ شاعر کسی وجہ سے(بہ سلسلہ ملازمت)اس شہر میں ایک مدت تک مقیم رہتا ہے لیکن اس کے اور اِس شہر کے درمیان محسوساتی اور جذباتی نوعیت کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہو پاتا جو شاعر کے لیے ایک تکلیف دہ صورت ہے اور اسی کرب کا اظہار اس نظم میں ایسے انوکھے پیرائے میں ہوا

ہے کہ اس نظم کو شہری زندگی پر لکھی گئی دنیا کی نمائندہ نظموں میں فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ جہاں وہ قیام پذیر رہتا ہے وہ جگہ اس کے دل میں بسیرا کر لیتی ہے اور اس کے پاؤں اس زمین میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیتے ہیں۔ انسان اور مکان کے درمیان یہ رشتہ ایسا اٹوٹ ہوتا ہے کہ جدائی دشوار ہوتی ہے لیکن جب شاعر کراچی سے جدا ہونے لگا تو اُسے ایک مختلف نوع کے دکھ سے دوچار ہونا پڑا۔اس کے پاؤں اس مٹی سے جدا ہوتے ہوئے دکھی ضرور ہوئے لیکن اس کی بے حسی پر! لیکن یہ بے حسی اس نوعیت کی بھی نہیں جسے آڈن نے ایک بڑے شہر میں قیام کے تجربے کو عمر رسیدہ عورت کے ساتھ ہم بدن ہونے کے مماثل قرار دیا تھا کیوں کہ شاعر کا اس شہر کے ساتھ تو کسی طرح کا بھی رشتہ قائم نہیں ہو سکا۔(یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یہ پہلا تأثر ہے جو آخری سطور میں زائل ہو جائے گا اور نظم نئی کروٹ لے گی)۔

جوں ہی نظم کا دروازہ کھلتا ہے ایک غیر جمالیاتی اور بھدا منظر آنکھوں کے سامنے پڑا ملتا ہے۔کیکڑے کی تشبیہ سمندر کے کنارے آباد ہونے کی نسبت سے اِس شہر کے لیے از حد موزوں اور موضوع کو فروغ دینے کا وسیلہ بنی لیکن اس کا اصل کما ل اس امیج میں ہے جو آئندہ بند میں اس کی ساخت کے بیان سے تکمیل پاتا ہے۔'نسیں اس کی فولا د وآ ہن/بدن ...... ریت سیمنٹ پتھر/بسیں، ٹیکسیاں، کاریں ،رکشا،رگوں میں لہو کی بجائے رواں/جسم پر جا بہ جا داغ دلدل نما'اِن ذیلی امیجز کے انسلاک و ارتباط نے کراچی کی جسمی،ذہنی اور جمالیاتی بد ہیئتی کی تصویر متحرک کر دی ہے۔انھی سطور میں ایک سمبل بھی در آیا ہے جس نے آگے چل کر نظم کی معنیاتی کشادگی میں خاص کردار ادا کرنا ہے،یعنی 'داغ' ۔شاعر نے اس سمبل کو دلدل سے تشبیہ دے کر ساحلی علاقے کی نسبت سے تخلیقی فریم کو بھی نامیاتی قوت فراہم کی ہے ۔ما بعد سطر میں ایک اور سمبل 'عنکبوت' کا ہے جس پر استعارے کا گمان بھی ہوتا ہے لیکن عالمی معیشت اور بین الاقوامی کمپنیوں کے جال اور ان کے پسِ پردہ محرکات کے تناظر میں یہ سمبل قرار پاتا ہے۔داغ و دلدل زمین سے منسلک تھے تو یہ فضا سے متعلق ہے۔ بنک بھی اسی مالیاتی نظام کا استعارہ ہے جس نے انسانوں کی تخلیقی کارکردگی کو ہڑپ کر لیا ہے۔ یہ مشرق و شمال کے عوام ہیں جنھیں نظم نے 'مگس' کے خوب صورت اور معنی آفریں استعارے میں پیش کیا ہے۔سمندر کی نمکین اور آلودہ فضا میں شہد تیار کرنے والے وجود کے تصور سے اثبات کا شیریں ذائقہ فزوں ہو کر نظم کی کارکردگی کو دوچند کر دیتا ہے۔مشرق و شمال کے عوام کی ایک جہت مقامی بھی ہے کہ اندرونِ ملک سے آنے والے کارکن یہاں کے سرمایہ دارانہ جال میں پھنس جاتے ہیں اور ان کی ساری صلاحیتیں یہ نظام چوس لیتا ہے ۔ان کے خوابوں کی تعبیر کارخانوں کے دھوئیں میں تحلیل ہو جاتی ہے ۔اور پیچھے گھروں میں ان کے اہلِ خانہ ان کا انتظار کرتے رہ جاتے ہیں۔

کراچی کو روشنیوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں رات پر بھی دن کا گماں ہوتا ہے۔بڑے بڑے اداروں کے اشتہاری بورڈ ساری رات رنگا رنگ تیز روشنیاں بکھیرتے ہیں،ٹریفک رواں رہتی ہے،دفاتر میں کام جاری رہتا ہے،کارخانے اور ملیں چلتی رہتی ہیں۔کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ یہ شہر سو جائے۔لیکن شاعر کے نزدیک یہ روشنی مثبت معانی کی حامل نہیں۔اس کی منفیت کو عیاں کرنے کے لیے نظم نے طوائف کے کوٹھے کی تشبیہ استعمال کی ہے ،جہاں رات دن سے بڑھ کر روشن ہوتی ہے لیکن لوگ یہاں سے(خوشی خوشی)اپنا سب کچھ لٹا کر نیچے اترتے ہیں۔ اس شہر کی روشن راتیں بھی اپنی چمک سے چندھا کر لوگوں سے حقیقت کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت چھین لیتی ہیں۔اس شہر کا اصل منفی پہلو یہ ہے کہ اسے اپنی تمام تر خرابیوں کی خبر ہے اور ان بد اعمالیوں پر اسے کوئی

شرمندگی اور پچھتاوا بھی نہیں بلکہ انھی کے باعث اس قدر پتھر دل ہو چکا ہے کہ اسی کردار پر فخر کرنے لگا ہے۔

'میں چاہت کے پھولوں بھرے جنگلوں سے جب آیا
تو اس شہر کی پیٹھ محبس کی دیوار کی طرح میری طرف تھی'

ان مصرعوں سے نظم کراچی کے عمومی کردار کا خاکہ ادھورا چھوڑ کر شاعر کی اس شہر میں آمد کا منظر دکھاتی ہے۔شاعر ایک ایسے ماحول سے یہاں آیا ہے جہاں اپنائیت اور محبت کے فطری جذبات زندہ ہیں ۔لیکن اس شہر میں اسے معاشرتی بے رخی سے واسطہ ہے۔جنگل آزادی، اور فطرت سے قرب کی علامت ہے جس کے باشندے کی طرف اس شہر نے اپنی پشت پھیر لی۔اگرچہ شاعر اس قید خانے کا حصہ بننے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ ایک ضرورت اسے کچھ وقت کے لیے یہاں لے آئی تھی۔اور اب اسے سماجی زندگی گزارنے کے لیے میل جول کی فطری احتیاج پریشان رکھتی ہے لیکن کوئی اس کی تنہائی کا درماں نہیں۔ہوا، جو زندگی اور آزادی کی علامت ہے اور خاص طور پر سمندر کی وسعت کی رعایت سے اسے وسیع القلب ہونا چاہیے لیکن اس شہر کی بری خصلتوں کے باعث اس کے اطوار بھی بدل گئے ہیں۔وہ بھی اس سے بے گانہ ہے۔گویا زندگی کی اصل ضامن بھی اس پر مہربان نہیں ہو رہی ۔ یہ شہر اور شاعر کے درمیان لاتعلقی کی انتہا ہے۔لیکن شاعر کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ موجود ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ ہوا تو خود اس شہر کی آلودہ فضا میں بمشکل سانس لے رہی ہے۔ یعنی جب زندگی کی ضامن کو خود زندگی کے لالے پڑے ہوں تو وہ دوسروں میں کیسے زندگی بانٹے گی؟ شاعر نے ہوا کے گریز کو اس کے احساسِ ندامت سے تعبیر کیا ہے ۔یوں نظم نے فطرت کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کا بالواسطہ اظہار کر دیا۔

اس دورانیے میں کئی ایسے مواقع بھی آئے جب اس لاتعلقی کا خاتمہ یقینی دکھائی دینے لگا۔اس جانب کوئی واضح واقعاتی تفصیل تو نہیں ملتی لیکن ایک 'مشترک دکھ کی زنجیر' کا اشارہ ظاہر کرتا ہے کہ سماجی زندگی میں کئی ناگہانی آفات آتی ہیں جو انسانوں کے درمیان دوریوں کو مٹا کر انھیں ایک رشتے میں پیوند کر دیتی ہیں۔کوئی حادثہ،سمندری طوفان،کوئی وبا، حکومتی زیادتی،کسی دشمن کا وار وغیرہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جو بکھرے ہوئے انسانوں کو ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں۔مثلاً جنگ بظاہر انسانیت کے لیے تباہ کن ہے لیکن ۱۹۶۵ء کی بھارتی جارحیت نے پاکستانی قوم کو ایک مٹھی کی مانند متحد کر دیا۔دو عالمگیر جنگوں میں یورپ کو زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس کے بعد اس براعظم کی برق رفتار ترقی آج سب کے سامنے ہے۔گویا مصیبت بھی انسانی معاشرے کی تعمیر کا باعث بنتی ہے ۔لیکن یہاں ایسے حالات میں بھی شاعر اور شہر کے درمیان حائل دیوار نہ گری۔نظم نے اس موقع پر 'اِس کی پتھرائی آنکھوں میں عکسِ شناسائی ناپید تھا' میں 'پتھرائی آنکھوں' کے بصری امیج کے برمحل استعمال سے موضوع کو نقطہ عروج تک پہنچا دیا ہے۔اب شہر کی بے حسی بے بسی میں تبدیل ہو گئی ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کے باطن میں زندگی کے تمام نازک جذبات موجود تھے لیکن ان پر ایک موٹی تہ آ گئی تھی۔جس کی جانب نظم نے ابتدا میں اشارہ کر دیا تھا۔'کھردری کھال' کے امیج نے یہاں آ کر اپنی معنویت کا دائرہ مکمل کر لیا ہے۔ یہاں تک شاعر کی شہر کے ساتھ کوئی رشتہ استوار کرنے کی ناکام کوششوں کی روداد تھی۔اب شاعر کی یہاں سے روانگی کا وقت آ گیا ہے:

'اور اب جب میں اِس شہر سے جا رہا ہوں

تو اِس کی درانتی سی بانہوں کے دندانے

میرے رگ و پے میں اُترے ہوئے ہیں۔'

یہ سطور نظم کو ایسا اختتام دیتی ہیں کہ پہلی قرأت میں ذہن اس جانب جاہی نہیں سکتا۔لگتا ہے کہ الوداعی معانقہ بھی ایک طرح سے شہر کا شاعر سے معاندانہ سلوک ہے۔لیکن اصل میں وہ اس کی جدائی نہیں چاہتا۔یہ تو اس کی ساخت کا شاخسانہ ہے کہ معانقے میں شاعر زخمی ہوا۔(یہاں نظم نے کراچی کے لیے اختیار کردہ کبیری استعارے، کیکڑے، کے پنجوں کو درانتی سے تشبیہ دے کر لفظ و معنی کی تندی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔)شہر تو اس کی جدائی کے صدمے سے دو چار تھا اور جانے سے روکنے پر مصر! کیوں کہ یہی تو ایک انسان آیا تھا جس نے اُس کے دکھ کو سمجھا اور اس کے زبوں حال پر ملول رہا۔ان سطور کی ایک جہت اور بھی ہے کہ شہر کی تمام تر بے مروتی کے باوجود اس کی یادیں شاعر کے ذہن سے محو نہیں ہو رہیں۔وہ اسے بھلا نے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پایا۔اپنے ملک کے کسی شہر کو اپنے دل سے کوئی شاعر کیسے نکال کر پھینک سکتا ہے۔یہ بات اس نظم سے پوچھیے۔